INSIDE THE BOOK

آزاد کی وصیت کے مطابق تیس سال تک مہر بند رکھے گئے صفحات کے اضافوں کے ساتھ

INDIA WINS FREEDOM

آزادئ ہند

مولانا ابوالکلام آزاد

مترجم
شمیم حنفی

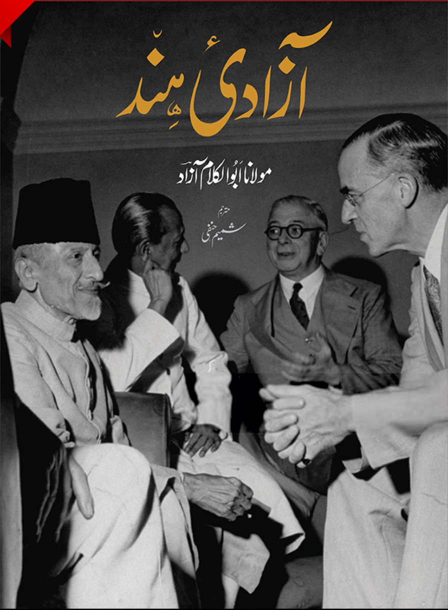

آزادؔ کی وصیت کے مطابق تیس سال تک مہر بند رکھے گئے صفحات کے اضافوں کے ساتھ

INDIA WINS FREEDOM

آزادیٔ ہند

مولانا ابوالکلام آزادؔ

مترجم

شمیم حنفی

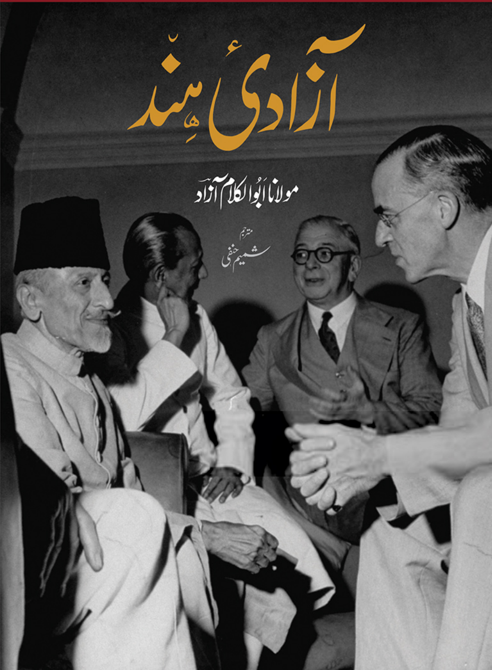

مولانا ابوالکلام آزاد (1888ء–1958ء) کا نام پیدائش پر فیروز بخت رکھا گیا مگر جوانی میں وہ محی الدین احمد کے نام سے جانے گئے اور اُس کے بعد انھوں نے ابوالکلام آزاد کا قلمی نام اختیار کیا۔ اُن کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آیا۔ ان کے بزرگوں میں معروف علما اور عہدے دار شامل تھے۔ مکہ معظّمہ میں ان کی پیدائش کے دو برس بعد، جہاں ان کے والد مولانا خیر الدین 1857ء کے غدر کے بعد ہجرت کر گئے تھے، ان کے خاندان نے کلکتے میں اقامت اختیار کر لی۔ آزاد کو ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد اور پرائیویٹ اساتذہ سے ملی۔ ان کی سیاسی بیداری کو 1905ء میں بنگال کی تقسیم (جو بعد میں مسترد کر دی گئی) سے تحریک ملی۔ اُنھوں نے عراق، مصر، ترکی اور فرانس میں دُور دُور تک سفر کیے۔ مولانا آزاد نے جولائی 1912ء میں کلکتے سے اُردو ہفتہ وار ''الہلال'' کا اجرا کیا۔ انھوں نے جدوجہدِ آزادی میں علی گڑھ کے علیحدگی کے رویے کی مخالفت کی۔ یورپ میں 1914ء کی لڑائی چھڑنے پر ان کا اخبار پریس ایکٹ کے تحت بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد نومبر 1915ء میں، کلکتے ہی سے انھوں نے ایک اور اُردو ہفتہ وار ''البلاغ'' جاری کیا۔ مارچ 1916ء میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت آزاد کی شہر بدری تک برابر نکلتا رہا۔ بمبئی، پنجاب، دہلی اور صوبہ جات متحدہ کی سرکاروں نے ان کے داخلے پر پابندی لگا دی اور وہ بہار چلے گئے۔ یکم جنوری 1920ء تک وہ رانچی میں نظر بند رہے۔ رہائی کے بعد آزاد کو (1920ء کے کلکتہ اجلاس میں) آل انڈیا خلافت کمیٹی کا صدر اور 1924ء میں دہلی کی اتحاد کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ انھوں نے 1928ء میں نیشنلسٹ مسلم کانفرنس کی صدارت کی۔ 1923ء میں، بعد ازاں 1940ء وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب کیے گئے اور اس منصب پر 1946ء تک فائز رہے۔ 1946ء میں انھوں نے برٹش کیبنٹ مشن سے کانگریس پارٹی کے مذاکرات کی قیادت کی۔ اس کے بعد آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے شامل ہوئے اور وہ اس منصب پر 22 فروری 1958ء کو اپنے انتقال تک کام کرتے رہے۔ ان کی دوسری مطبوعہ کتابوں میں ''البیان'' (1915ء) اور ''ترجمان القرآن'' (1933ء–1936ء) جو تفسیریں ہیں، ''تذکرہ'' (1916ء) جو خودنوشت سوانح ہے اور ''غبارِ خاطر'' (1943ء) جو مکاتیب کا مجموعہ ہے، شامل ہیں اور یہ تمام کتابیں اُردو میں ہیں۔

ہمایوں کبیر (1906ء - 1969ء) کلکتہ اور آکسفرڈ یونیورسٹی میں ایک ممتاز تعلیمی کیریئر کے بعد وہ پہلے وائس چانسلر کے مقام پر آندھرا یونیورسٹی میں، اور پھر کلکتہ یونیورسٹی میں لیکچرر کی حیثیت سے 1933ء تا 1945ء کام کرتے رہے۔ 1937ء میں انھیں بنگال لیجسلیٹو کونسل کے لیے کسان پارٹی کے قائد کی حیثیت سے منتخب کرلیا گیا۔ 1946ء میں آزاد نے ان کا انتخاب اپنے سیکریٹری کے طور پر کیا۔ چنانچہ آزاد سے ان کا قریبی تعلق رہا۔ حکومت ہند کے مشیرِ تعلیم کی حیثیت سے وہ 1956ء تک کام کرتے رہے، پھر وہ مستعفی ہوگئے اور 1957ء میں وہ کانگریس پارٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے پارلیمینٹ کے لیے چن لیے گئے۔ انھیں (1957ء - 1958ء) وزیر برائے شہری ہوابازی، (1958ء - 1963ء) وزیر برائے سائنسی تحقیقات اور ثقافتی امور اور (1963ء تا 1968ء) وزیر برائے پٹرولیم اور کیمیکلز مقرر کیا گیا۔ انگریزی اور بنگلا زبانوں میں وہ بیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں جو فلسفے، ادبیات، سیاسیات اور ثقافت کے موضوعات پر لکھی گئیں۔ ان کے دو ناول اور تین شعری مجموعے بھی شائع ہوئے۔

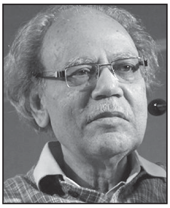

شمیم حنفی (17 مئی 1938ء) اُردو کے ایک معروف نقاد، ڈراما نگار، مترجم اور شاعر ہیں۔ سلطان پور (یوپی) میں پیدا ہوئے اور ابتدائی زندگی وہیں پر گزاری۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے اُردو اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں ستیش چندر دیب، فراق گورکھپوری، احتشام حسین اور اعجاز حسین ایسے صاحبانِ علم وفضل شامل تھے۔ چھ برس علی گڑھ یونیورسٹی میں تدریس سے متعلق رہنے کے بعد 1976ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے، جہاں 2003ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک پڑھایا۔ اس کے بعد سے اسی تعلیمی ادارے میں پروفیسر ایمریطس کی حیثیت سے منسلک ہیں۔ شمیم حنفی کا شمار عہدِ حاضر کے اہم ترین ناقدین میں ہوتا ہے۔ ان کی تنقید بھی اپنے ہم عصروں سے کئی سطحوں پر مختلف ہے۔ ان کے یہاں تنقید لکھنے کا عمل ایک معنی میں وسیع تر تخلیقی سرگرمی سے عبارت ہے۔ فن پاروں کے اسرار تک پہنچ جانے کی جو چند مثالیں اُردو تنقید میں ملتی ہیں ان میں شمیم حنفی کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ ایک گہرا وجودی طرزِ فکر واحساس ان کی تحریروں کی شناخت کے طور پر ابھرتا ہے۔ ان کے اُردو تراجم میں زیرِنظر کتاب کے علاوہ ’قومی یکجہتی اور سیکولرازم‘ (ڈاکٹر تاراچند کے خطابات)، ’’یادوں کا اُجالا‘‘ (ڈاکٹر بھگوان سنگھ کی خودنوشت)، ’’شہرِ خُوں آشام‘‘ (معاصر بنگالی زبان کی شاعری)، ’’منتخب تحریریں: جدوجہد کے سال‘‘ (پنڈت جواہرلعل نہرو کی تحریر Years of Struggle کا ترجمہ) شامل ہیں۔ شمیم حنفی ایک شاعر، نقاد، ڈراما نگار اور مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ کئی عملی فنون، مصوری، کمہار کے فن وغیرہ میں بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

INDIA WINS FREEDOM

آزادیٔ ہند

ایک تاریخ جو آپ بیتی بھی ہے

آزاد کی وصیت کے مطابق تیس سال تک مہر بند رکھے گئے تیس صفحات کے اضافوں کے ساتھ

مولانا ابوالکلام آزاد

مرتّب

ھمایوں کبیر

مترجم

شمیم حنفی

بُک کارنر

جہلم، پاکستان

Azadi-e-Hind
by Maulana Abul Kalam Azad
Trans. Shamim Hanfi
Jhelum: Book Corner. 2020
383p.
1. Autobiography - History
ISBN: 978-969-662-305-2

1959ء۔ پہلی مرتبہ مختصر متن انگریزی میں "India Wins Freedom" کے ٹائٹل سے دہلی (ہندوستان) سے ادارہ ’اورینٹ لونگ مین لمیٹڈ‘ نے شائع کیا۔

1988ء۔ تیس صفحات کے اضافے کے ساتھ ہمایوں کبیر کا مرتب کردہ مکمّل متن ادارہ ’اورینٹ لونگ مین لمیٹڈ‘ نے ہی انگریزی میں شائع کیا۔

1991ء۔ شمیم حنفی نے ہمایوں کبیر کا مرتب کردہ مکمّل متن اُردو میں منتقل کیا جسے ’’ہماری آزادی‘ کے نام سے ’اورینٹ لونگ مین لمیٹڈ‘ نے شائع کیا۔

2020ء۔ شمیم حنفی کا ترجمہ ’’آزادیٔ ہند‘‘ کے نام سے جہلم (پاکستان) سے ’بک کارنر‘ نے نستعلیق کمپوزنگ، تصاویر اور جدید طباعت کے ساتھ شائع کیا۔

© بک کارنر

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ ناشر کی پیشگی اجازت کے بغیر کسی بھی وضع یا جلد میں کلّی یا جزوی، منتخب یا مکرر اشاعت
یا بہ صورت فوٹو کاپی، ریکارڈنگ، الیکٹرانک، مکینیکل یا ویب سائٹ پر اَپ لوڈنگ کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔
قانونی مشیر: عبدالجبار بٹ (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

مہتمِمِ اعلیٰ: شاہد حمید

ناشرین: گگن شاہد * اَمر شاہد

تعداد: ایک ہزار

کتاب: آزادیٔ ہند

مصنف: مولانا ابوالکلام آزاد

مرتب: ہمایوں کبیر

مترجم: شمیم حنفی

لفظ خواں: راجہ الطاف احمد

سرورق: ابو امامہ

خطاط: احمد علی بھٹہ

کمپوزنگ وصفحہ سازی: عمر فاروقی

کتابت: نُوری نستعلیق، علوی نستعلیق

مطبع: رفاقت پریس، لاہور

ناشر: بک کارنر

ویب سائٹ: www.bookcorner.com.pk

بک سٹور: بک کارنر شورُوم، بالمقابل اقبال لائبریری، اقبال لائبریری روڈ، جہلم، پاکستان 49600
00 92 544 278051, 00 92 544 614977 00 92 314 4440882, 00 92 321 5440882
bookcornerjlm /bookcornershowroom /bookcorner
bookcornerjhelum info@bookcorner.com.pk

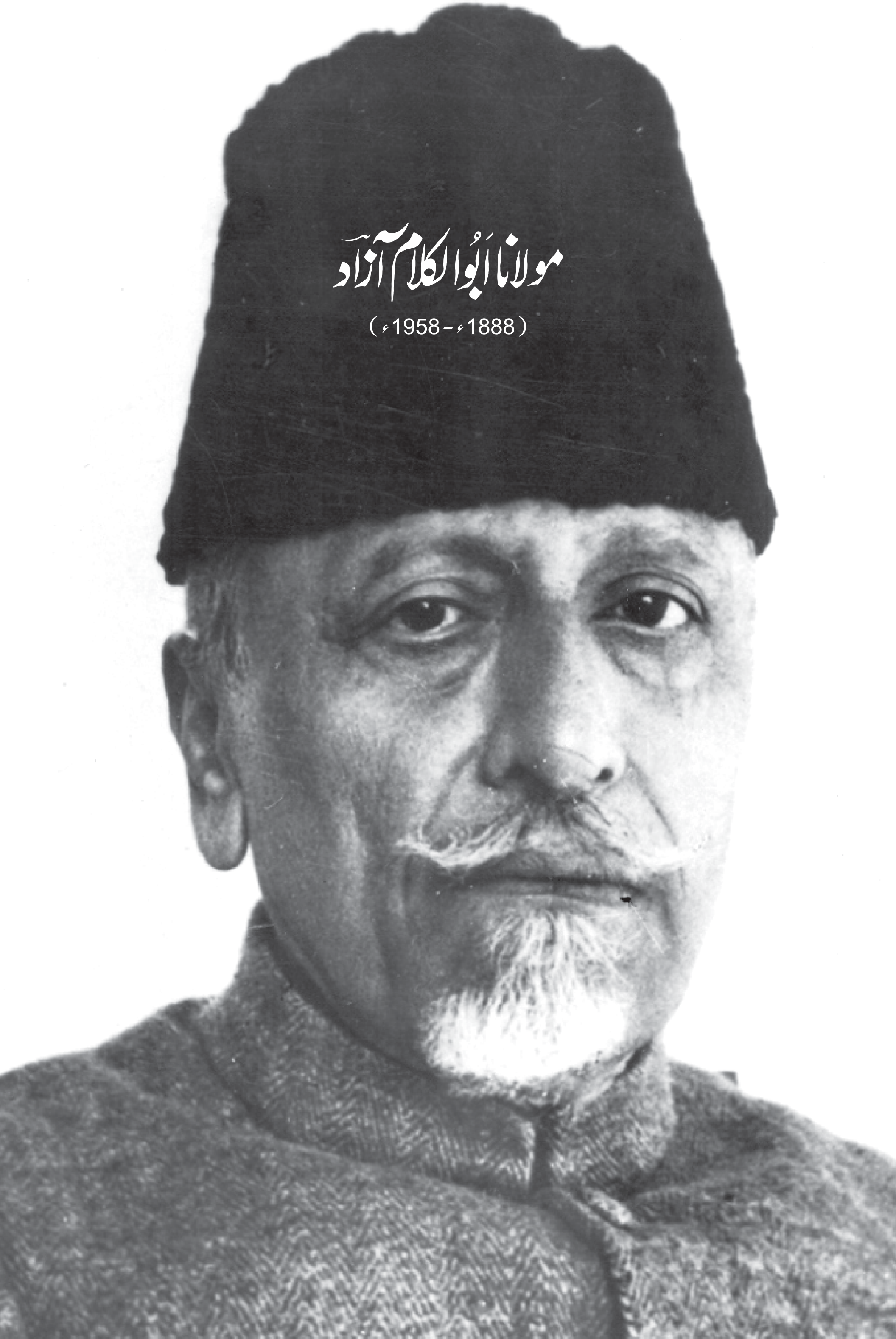

مولانا ابوالکلام آزاد

(1888ء-1958ء)

گاندھی، پٹیل اور مولانا آزاد، اے آئی سی سی میٹنگ بمبئی

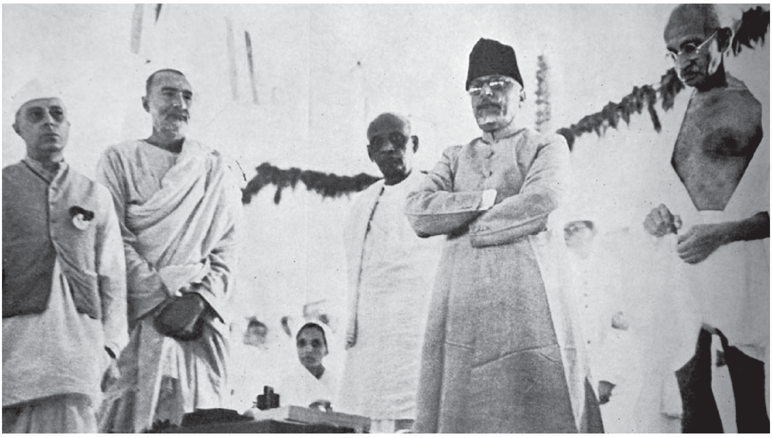

گاندھی، مولانا آزاد، پٹیل، عبدالغفار خان اور جواہر لال نہرو، اے آئی سی سی میٹنگ بمبئی

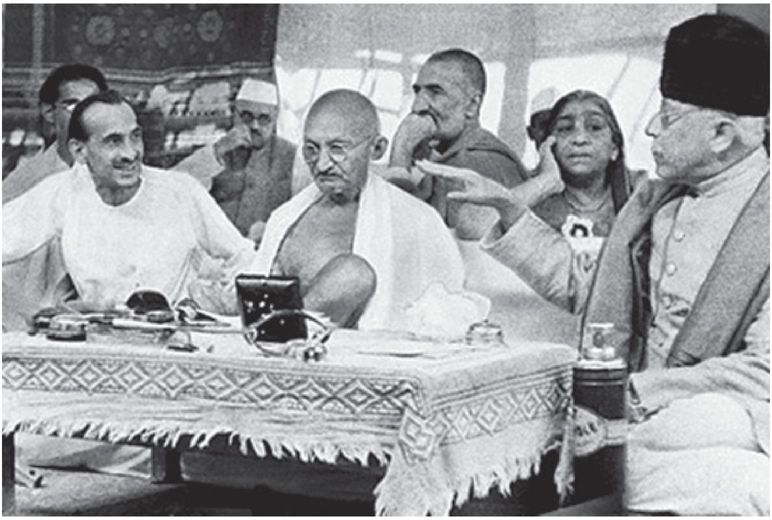

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ، واردھا

مولانا آزاد، جواہر لال نہرو اور گاندھی، واردھا میں

5 مئی 1946ء۔مولانا ابوالکلام آزاد اور لارڈ پیتھک لارنس

لارڈ ویویل، وائسرائے ہند کانفرنس کے افتتاح پر
انڈین نیشنل کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد سے مصافحہ کرتے ہوئے

صدر کانگریس، مولانا آزاد، وائسریگل لاج پہنچتے ہوئے
دائیں سے بائیں: لارڈ پیتھک لارنس، مولانا ابوالکلام آزاد سر سٹیفر ڈ کرپس اور مسٹر اے وی الیگزینڈر

برطانوی کیبنٹ مشن کے دوران سردار پٹیل مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ

آزاد، نہرو اور پٹیل سبجیکٹس کمیٹی میٹنگ میں، انڈین نیشنل کانگریس کا 55واں اجلاس

18 اگست 1947ء۔مولانا آزاداور لارڈ ماؤنٹ بیٹن

18 اگست 1947ء۔مولانا آزاداور ایس رادھا کرشنن

1948ء-ابوالکلام آزاد، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن، گاندھی کی میت پر

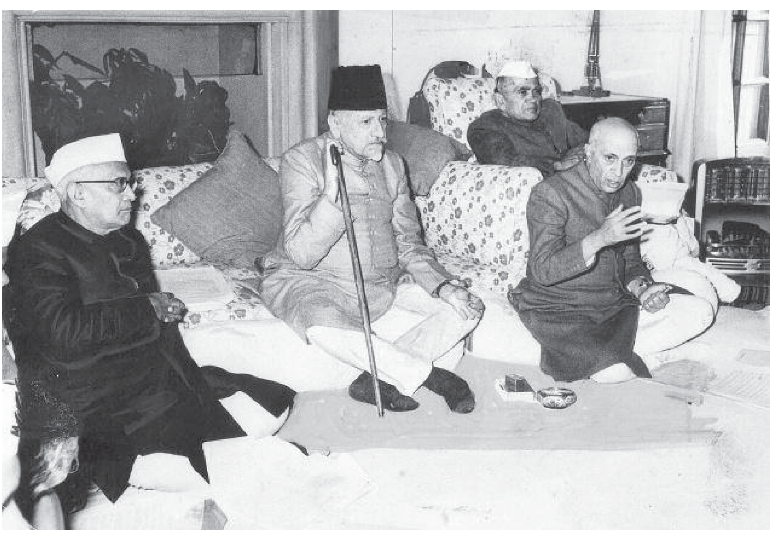

جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد

فہرست

❋	انڈین پبلشر کا نوٹ	(اورینٹ لونگ مین لمیٹڈ)	21
❋	''انڈیا ونس فریڈم'' پر ایک نظر	(شمیم حنفی)	23
❋	دیباچہ اشاعت 1959ء	(ہمایوں کبیر)	32
❋	کیفیت نُما		37
۱	کانگریس، اقتدار میں		53
۲	یورپ میں جنگ		69
۳	میں کانگریس کا صدر بنایا گیا		73
۴	چین کی طرف گُریز		90
۵	کرپس مشن		96
۶	بے چینی کا وقفہ		127
۷	ہندوستان چھوڑ دو		138

۸	قلعہ احمد نگر جیل	149
۹	شملہ کانفرنس	169
۱۰	عام انتخابات	193
۱۱	برٹش کیبنٹ مشن	218
۱۲	تقسیم کا پیش خیمہ	238
۱۳	انٹرم حکومت	254
۱۴	ماؤنٹ بیٹن مشن	280
۱۵	ایک خواب کا خاتمہ	297
۱۶	منقسم ہندوستان	317
*	حرفِ آخر	341

ضمیمہ 1	مرتب کا نوٹ	349
ضمیمہ 2	برطانوی حکومت کی 29 مارچ 1942ء کی تجاویز	352
ضمیمہ 3	سر سٹیفرڈ کرپس سے خط و کتابت	355
ضمیمہ 4	ہندوستان چھوڑ دو قرارداد	370
ضمیمہ 5	برطانوی حکومت کا 3 جون کا بیان	376

انڈین پبلشر کا نوٹ*

ستمبر 1958ء میں مولانا آزاد کی اچانک وفات کے سات مہینے بعد جب مرحوم پروفیسر ہمایوں کبیر نے ''ہماری آزادی'' کا مسودہ ہمارے حوالے کیا، ہمیں یہ اطلاع دی گئی کہ تقریباً تیس صفحات کے اضافے کے ساتھ مکمّل متن 22 فروری 1988ء کو مولانا آزاد کی تیسویں برسی کے موقع پر ہمیں اشاعت کے لیے دے دیا جائے گا۔

بہرنوع جب یہ وقت آیا تو اس معاملے سے دلچسپی کا دعویٰ رکھنے والے افراد کی جانب سے متعدد سوال اُٹھ کھڑے ہوئے اور مکمّل متن کی فراہمی کا کام التوا میں پڑ گیا۔ ان سوالات کی شنوائی کلکتہ ہائی کورٹ، دہلی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں ہوئی۔ پھر دہلی ہائی کورٹ کے جسٹس بی این کرپال نے 22 ستمبر 1988ء کو ہدایت دی کہ نیشنل لائبریری کلکتہ اور نیشنل آرکائیوز میں جمع شدہ متن کی نقلیں 29 ستمبر 1988ء کو ''اورینٹ لونگ مین'' کے حوالے کر دی جائیں۔ عدالت نے یہ ہدایت بھی دی کہ سارا مواد، یہ دیکھ لینے کے بعد کہ نقل اور اصل میں مکمّل مطابقت ہے، بغیر کسی تحریف کے شائع کیا جائے، یہی کیا گیا ہے۔

---

* اورینٹ لونگ مین لمیٹڈ، 1/24 آصف روڈ، نئی دہلی، اشاعت 1988ء

مواد کا جائزہ لینے پر یہ بات صاف ہوگئی کہ عام خیال کے برعکس اضافے کی عبارت محض مزید تیس صفحات پر مشتمل نہیں تھی بلکہ پورے متن میں جابجا بکھری ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں فقروں، مسلسل جملوں اور کئی عبارتوں سے قطع نظر جو شائع شدہ متن میں چھوڑ دی گئی تھیں، پروفیسر کبیر کی ایڈیٹوریل مداخلت کے باعث کئی مقامات پر اصل متن میں ردّ و بدل بھی کر دیا گیا تھا۔ (ملاحظہ ہو ضمیمہ-1، 'مرتب کا نوٹ')

موجودہ ایڈیشن ہمیں فراہم کی جانے والی نقول کے مطابق مکمّل متن پر مشتمل ہے۔ گزشتہ عبارت میں اہم اضافوں کی نشاندہی شروع اور اخیر میں ★ علامت کے ذریعے کر دی گئی ہے۔ پہلی جلد کا خلاصہ جو پچھلی اشاعت میں شامل تھا، اسے جُوں کا تُوں باقی رکھا گیا ہے۔ اس اشاعت میں شامل ضمیمے بھی عین مین منتقل کر دیے گئے ہیں۔

اکتوبر 1988ء

’’انڈیا ونس فریڈم‘‘ پر ایک نظر

(INDIA WINS FREEDOM)

برنارڈ شا کا خیال ہے کہ ہر خودنوشت سوانح عمری جھوٹی ہوتی ہے اور اس کی وجہ شا کے نزدیک بہت صاف ہے۔ کوئی بھی شخص اتنا بُرا نہیں ہوتا کہ جیتے جی اپنے بارے میں، اپنے خاندان کے بارے میں، اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے بارے میں سچ بول سکے۔

مولانا آزاد اپنی طبیعت کے لحاظ سے بہت متین، بہت کم آمیز اور بہت خاموش انسان تھے۔ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں وہ بڑی مشکل سے زبان کھولتے تھے۔ ہمایوں کبیر کا بیان ہے کہ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ لکھنے پر انھیں خاصی جدّوجہد کے بعد آمادہ کر سکے تھے۔ ایسا نہیں کہ مولانا دلچسپ گفتگو کے جوہر سے عاری رہے ہوں، ان کا حافظہ غیر معمولی تھا اور مولانا کے کئی جاننے والوں کا بیان ہے کہ اپنے تجربوں کی روداد سناتے وقت ایسا لگتا تھا کہ مولانا کو تمام تفصیلات اچھی طرح یاد ہیں۔ ان میں صاف گوئی کی عادت بھی تھی، خاص طور پر سماجی اور اجتماعی معاملات پر بات چیت میں۔

مولانا بنیادی طور پر ایک دانشورانہ ذہن رکھتے تھے۔ اشخاص اور واقعات سے زیادہ اہم ان کی نظر میں تصورات تھے۔ مولانا کے لیے اپنی زندگی کی کہانی، دراصل اپنے ذہنی سفر کی کہانی تھی۔ مولانا ہر واقعے اور عمل کے مفہوم کا تعین، اس کے اخلاقی قدر کی بنیاد پر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس

کے لیے اعلیٰ ذہن کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ظرف کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اوچھا آدمی اخلاقیات کے نام سے بھی چڑ جاتا ہے اور معمولی ذہن رکھنے والے کی گفتگو کا دائرہ بس افراد اور واقعات کی بیرونی سطح تک محدود رہتا ہے۔ شاید اسی لیے مولانا کی زندگی میں بھی ان کے مدّاح کم رہے، مخالف زیادہ۔ مولانا بصیرت کی جس سطح سے گردوپیش کی دُنیا کا مشاہدہ کرتے تھے وہ ایک گہری فلسفیانہ سطح تھی۔ غبارِخاطر میں ایک جگہ مولانا نے لکھا ہے کہ ''میں جب کبھی قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لیے سزا کیسے ہوسکتی ہے۔ اگر دُنیا اس کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے حاصل کی جا سکیں۔'' اس سلسلے میں مولانا نے ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ انھی کے لفظوں میں:

> ''ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے، مجھے ایک کوٹھری میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً تیّار ہوگیا کہ مجھے ایسی جگہ رکھے جہاں اور لوگ بھی رکھے جا سکیں اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان حضرت سے کہا، آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی مگر آپ کو معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی راحت یہاں حاصل تھی وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھنی جا رہی ہے۔''

ایسا شخص جسے فراق صاحب کے لفظوں میں Companionship of Loneliness عزیز رہی ہو، جس نے ایک نہایت سرگرم اجتماعی زندگی گزارنے کے باوجود اپنی خلوت گزینی کا بھرم بنائے رکھا ہو، اس کی آپ بیتی کے اصل عناصر اور اوصاف کیا ہو سکتے ہیں۔ مولانا کی تمام تحریروں میں ایک بات جو بہت نمایاں ہے، یہ ہے کہ مولانا اجتماعی واردات کو بھی ایک شخصی واردات کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ مولانا اپنی یا اپنے عہد کی کہانی کے کردار اور راوی ہی نہیں اس کے مبصر بھی ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں دوسروں کے لیے دلچسپی کا جو سامان پیدا ہوا ہے اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ان سے وابستہ ہر واقعے اور تذکرے میں ہم تصور کے کسی نہ کسی منطقے سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔ شا نے اپنی زندگی کا حساب کرتے ہوئے اپنے مخصوص ذہانت آمیز انداز میں کہا تھا:

''لوگ مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ میں اپنی خودنوشت سوانح عمری کیوں نہیں لکھتا۔ میں یہ جواب دیتا ہوں کہ سوانح عمری کے اعتبار سے میں قطعاً دلچسپ نہیں ہوں۔ میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ کوئی بہت انہونی بات میرے ساتھ کبھی نہیں ہوئی۔ میں نے کوئی مہم سر نہیں کی۔ اشیا مجھ پر وارد نہیں ہوئیں۔ اس کے برخلاف ہوا یہ کہ میں ان (اشیا) پر وارد ہوتا رہا اور میری ان تمام وارداتوں نے کتابوں اور ڈراموں کی صورتیں اختیار کرلیں۔''

سو، اس حساب سے دیکھا جائے تو ہر سچا لکھنے والا عمر بھر آپ بیتی ہی لکھتا رہتا ہے۔ نفسیاتی سطح پر اس سلسلے میں جو واقعہ میرے لیے زیادہ توجہ طلب ہوسکتا ہے، یہ ہے کہ مولانا کی تمام تحریریں، ان کے موضوعات جو بھی ہوں، انتہائی معنی خیز اعترافات سے بھری پڑی ہیں۔ ان تحریروں میں ہم دانشوری کے ایک مربوط نظام، ایک سلسلے، ایک روایت کے ساتھ ساتھ دانشوری کے ایک انتہائی منفرد اور شخصی معیار سے متعارف ہوتے ہیں اور کئی وجہوں سے، میں یہ سوچتا ہوں کہ اس ضمن میں ''انڈیا ونس فریڈم'' مولانا کی دوسری تمام تحریروں سے بہت مختلف بھی ہے۔

''انڈیا ونس فریڈم''، ''تذکرہ'' یا مولانا کی سوانحی نوعیت کی کسی اور تحریر سے الگ ایک نیا آہنگ رکھتی ہے۔ یہ ''تذکرہ'' کی توسیع یا مولانا کی آپ بیتی کے رسمی بیانات کا سلسلہ بھی نہیں ہے۔ ایک بہت اہم فرق جو سوانحی قسم کی دوسری تمام تحریروں میں اور ''انڈیا ونس فریڈم'' میں صاف دکھائی دیتا ہے، یہ ہے کہ اس کتاب میں جذبات پر گرفت بہت مضبوط ہے۔ داخلی ہیجانات کی ایک دھیمی سوزش کا احساس تو اس کتاب کو پڑھتے وقت ہوتا ہے مگر یہ ہیجانات کہیں بے قابو نہیں ہوتے۔ اپنے آپ سے لاتعلقی، اپنے باطن پر وارد ہونے والی کیفیتوں سے ایک سوچا سمجھا فاصلہ، ذاتی تاثّرات کے بیان میں بھی ایک مستقل معروضیت، ''انڈیا ونس فریڈم'' سے زیادہ مولانا کی کسی اور کتاب میں نہیں ملتی۔ کہیں کہیں تو عقلیت کی لَے اتنی اونچی ہوگئی ہے کہ اس پر عام انسانی تجربوں کے تئیں ایک طرح کی سردمہری کا گمان ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا نے اس کہانی کے بیان میں جو آپ بیتی اور جگ بیتی کے فرق کو مٹاتی ہے، اپنے پُرپیچ سماجی، سیاسی اور معاشرتی ماحول کا تجزیہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہاں مولانا کی بصیرت جذبے کو آگہی بنا دیتی ہے اور سماجی و سیاسی

ماحول سے اپنے رابطے کا مفہوم اس سطح پر متعین کرتی ہے جو صرف شخصی نہ ہو اور جس سے وابستہ تجربوں میں دوسرے بھی شریک ہو سکیں۔

اس نکتے کی وضاحت کے لیے میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ یہ مثال ''انڈیا ونس فریڈم'' کے اختتامیے کا آخری پیراگراف ہے۔ آزادی کی جدّوجہد کے نشیب و فراز، پھر تقسیم کے المیے، پھر گاندھی جی کی شہادت اور فرقہ وارانہ فسادات کا خوں چکاں قصہ رقم کرنے کے بعد مولانا کہتے ہیں:

> ''یہ خیال کہ مذہبی موانست ان علاقوں کو، جو جغرافیائی، اقتصادی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے مختلف ہے، باہم متحد کرسکتی ہے، عوام کے ساتھ کی جانے والی سب سے بڑی دھوکے بازیوں میں سے ایک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہا جو نسلی، لسانی، اقتصادی اور سیاسی سرحدوں سے اوپر اُٹھ سکے۔ تاریخ نے بہرحال یہ ثابت کر دیا ہے کہ پہلی چند دہائیوں، یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے بعد اسلام محض اسلام کی بنیاد پر قائم مسلم ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ صورتِ حال ماضی میں بھی تھی اور یہی صورتِ حال آج بھی ہے۔ کوئی بھی یہ اُمید نہیں کرسکتا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان اپنے تمام اختلافات طے کرلیں گے اور ایک قوم بن جائیں گے۔ حتیٰ کہ مغربی پاکستان کے اندر سندھ، پنجاب اور سرحد کے تینوں صوبے اندرونی غیر آہنگی رکھتے ہیں اور الگ الگ مقاصد اور مفادات کے لیے کام کر رہے ہیں، تاہم اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ پاکستان کی نئی ریاست اب ایک حقیقت ہے۔ یہ بات ہندوستان اور پاکستان کے حق میں ہے کہ وہ دوستانہ تعلقات کو فروغ دیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کریں۔ عمل کا کوئی بھی اور راستہ، صرف وسیع تر مشکلات، صعوبتوں اور بدبختیوں کی سمت لے جائے گا۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہوا، ناگزیر تھا۔ دوسرے لوگ اتنی ہی شدّت کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ ہوا غلط ہوا اور اسے ٹالا جا سکتا تھا۔ آج ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کون سی بات صحیح ہے۔ یہ فیصلہ تو صرف تاریخ ہی کرے گی کہ کیا ہمارا عمل دانشمندانہ اور درست ہے۔''

وہ کہانی جس کا سفر افسردگی اور اضطراب کے ایک مستقل ماحول میں ہوا تھا، یہ اس کہانی

کی تکمیل کا نقطہ ہے۔ وہ تمام تحریریں جو مولانا کے گرد و پیش کی دُنیا یا مولانا کے اپنے باطن کی دُنیا اور اس کی کیفیتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں اُداسی کی ایک زیریں لہر ہمیشہ مرتعش رہتی ہے۔ ایک دبا دبا سا انسانی سوز مولانا کے بیان کردہ تمام واقعات سے جھلکتا ہے۔ ہرچندکہ ''انڈیا ونس فریڈم'' کی بنیادی حیثیت ایک دستاویزی کتاب کی ہے مگر اس میں زندگی سے متعلّق تصورات اور تبصروں کی فلسفیانہ اور بوجھل فضا میں کہیں کہیں افسانے کی شان بھی دکھائی دیتی ہیں۔ مولانا کی مختلف گرفتاریوں کے قصے، ان کے معاصرین سے وابستہ واقعات اور سب سے زیادہ جیل سے نکلنے کے بعد زلیخا بیگم کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے مولانا کی حاضری کا واقعہ جیتی جاگتی کہانیاں ہیں۔ مولانا ایک انوکھی ہوشمندی کے ساتھ یہ کہانیاں سناتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ حقیقت اور تصور کی کائناتوں میں ان کا سفر ایک ساتھ جاری ہے۔ ان کہانیوں میں بعض اوقات جذبے کا بہت طاقتور اظہار ہوا ہے لیکن ان میں جذباتیت کا کوئی رنگ نہیں ملتا۔ ان کہانیوں میں مولانا کے باطن کا آشوب اپنے چھپائے جانے کی کوشش کے واسطے سے ظاہر ہوا۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ ''انڈیا ونس فریڈم'' ہم تک جس زبان کے واسطے سے پہنچی وہ اُردو نہیں انگریزی ہے۔ انگریزی اصلاً ایک تحت البیان ضابطے کی زبان ہے چنانچہ حواس اور اعصاب کی ابتری کے قصے بھی اس کتاب میں اتنے ہموار اور سنبھلے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے ان کے پَر کتر دیے گئے ہوں اور اب ان کے لیے پرواز ممکن نہ ہو۔ یوں بھی اُردو اور انگریزی میں فرق صرف رسمِ خط یا زبان کا نہیں، یہ زبانیں دو تہذیبوں، زندگی اور کائنات کی طرف دو رویوں، زندگی کے دو اسالیب کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہرچندکہ مولانا صاحبِ اسلوب نہیں بلکہ صاحبِ اسالیب مصنّف تھے اور ان کی مختلف کتابوں میں بیان اور اظہار کے مختلف آداب اختیار کیے گئے ہیں لیکن کچھ باتیں ان میں مشترک بھی ہیں مثلاً لسانی آرائش، ایک تصنع آمیز شعریت، مجرد افکار کے بیان میں بھی تشبیہ و استعارے کی مدد سے تصویر سازی کا جابجا اظہار، احساسات اور تاثّرات میں ایک دانستہ مبالغہ آمیزی، لفظوں اور جملوں میں تکرار اور لہجے میں غیرضروری حد تک تاکید کے عنصر کی موجودگی..... ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا اُردو نثر کو آگے کی طرف لے جانے کے بجائے اُلٹی سمت میں لے گئے۔ مولانا کی نثر کسی بھی لحاظ سے شبلی اور حالی کی نثر پر

اضافہ نہیں ہے۔ ابوالکلام آزاد کی نثر کے سامنے حسرت کے شعر کی بے مزگی کا تذکرہ دونوں کی خوبیوں کے بجائے دراصل ایک ساتھ دونوں کی کوتاہی کا اعلان ہے۔ ''انڈیا ونس فریڈم'' میں غیرضروری لفظوں اور صفات کا استعمال بہت کم اور مولانا کی اُردو نثر کے تناسب سے تو نہ ہونے کے برابر ہے۔

کتاب کے ''پیش لفظ'' میں ہمایوں کبیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اُردو اور انگریزی کے مزاجوں کا فرق انگریزی میں مولانا کے تصورات کی تعبیر کو خاصا دشوار بنا دیتا ہے۔ مولانا جس قسم کی اُردو لکھتے ہیں اسے اگر دیانت داری کے ساتھ انگریزی میں منتقل کیا جائے تو نتائج کم وبیش ویسے ہی ہوں گے جو جوش کی نظم کے انگریزی ترجمے میں قیاس کیے جا سکتے ہیں۔ ''انڈیا ونس فریڈم'' مولانا نے لکھی نہیں بلکہ بات چیت کی زبان میں لکھوائی ہے۔ اس لیے اس کا لہجہ اور آہنگ تحریری سے زیادہ حکائی (Oral) ہے۔ علاوہ ازیں، اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ کتاب بہ یک وقت دو اصحاب کے اشتراک کا حاصل ہے۔ مولانا اگر اپنی تنہائی میں یہ کتاب لکھتے تو واقعات اور ان کے تئیں مولانا کے نفسیاتی، جذباتی اور ذہنی ردعمل کی صورتیں وہ کچھ ہرگز نہ ہوتیں جیسی کہ اس کتاب میں رونما ہوئی ہیں۔

''انڈیا ونس فریڈم'' کا عنوان تو پُرجوش اور مثبت ہے مگر کتاب کا مجموعی تاثّر حزنیہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زیرِ بیان آنے والے تمام واقعات اور حالات پر ملال کی ایک دھند چھائی ہوئی ہے۔ اور تو اور مولانا نے کتاب کے پہلے باب میں جسے انھوں نے Prospectus یا کیفیت نما کا نام دیا ہے اور جس میں انھوں نے اپنے ذاتی اور خاندانی حالات کا خلاصہ پیش کیا ہے وہاں بھی دل گرفتگی اور فکری تنہائی سے بوجھل فضا کا احساس ہوتا ہے۔ کسی بڑے ادیب نے کہا تھا کہ بُری سے بُری خودنوشت سوانح عمری کا سب سے زیادہ لائقِ مطالعہ حصہ لکھنے والے کے بچپن کی یادیں ہوتی ہیں۔ مولانا کی ان یادوں کے بیان میں بھی جو چہرہ اُبھرتا ہے وہ اُن کے مانوس چہرے سے مختلف نہیں ہے۔ مولانا کی ذہنی عمر اُن کی طبعی عمر سے ہمیشہ زیادہ رہی۔ چنانچہ بچپن کا زمانہ بھی مولانا نے تقریباً اس طور سے گزارا جو زندگی بھر ان کا معمول بنا رہا۔ وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ مولانا کے تجربے میں جو افراد آئے ان میں اس عہد کی سب سے زیادہ معروف شخصیتوں کی اکثریت تھی، سو غیرمعمولی

انسانوں سے رابطے نے مولانا کی آپ بیتی کو بغیر کسی رنگ آمیزی کے ایک غیر معمولی شکل عطا کر دی۔ ورنہ آپ بیتی کے نام پر نہ تو صرف تاریخ پڑھی جاسکتی ہے نہ فلسفہ۔ دُنیا کے کئی بڑے لکھنے والے اس محاذ پر ناکام ہوئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے روزمرہ تجربات کا بیشتر حصہ اپنی معمولیت زدگی کے باعث غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ اپنی ہستی کی طرف اپنے رویے کی داخلیت ہم میں سے بہتوں کو اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے کہ ہمارے تجربات نہ صرف یہ کہ انوکھے ہیں، ہم اپنی جگہ یہ مان کر چلتے ہیں کہ ان تجربوں کا بیان سب سے، اہم اور پُرکشش ہوگا۔ ایک فرد اور دوسرے فرد کے عام تجربوں کی بیرونی صورتیں ایک دوسرے سے الگ سہی، مگر ان کی نوعیتیں، ان کی بنیادیں اور ان کے اثرات کم و بیش یکساں ہوتے ہیں۔ مولانا کے تجربے میں ذاتی زندگی کی سطح پر یا اس سے آگے اجتماعی تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی سطح پر جو افراد آئے، کسی نہ کسی لحاظ سے ہمارے لیے وہ اہم لوگ تھے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جن کی ہم قدر کرتے ہیں اور ایسے بھی جنھیں ہم میں کچھ لوگ ہوسکتا ہے کہ پسند نہ کرتے ہوں مگر ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ مولانا نے بھی مختلف افراد کے بیان میں ان کے تئیں مختلف رایوں کا اظہار کیا ہے۔ بعضوں کے لیے مولانا کی ناپسندیدگی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا نے کئی مقامات پر دیوتاؤں کے مٹی کے پاؤں بھی دکھائے ہیں اور کہیں کہیں تحسین و ستائش کے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے۔

لیکن دونوں سطحوں پر مولانا کا ضبط اور ظرف ایک سا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مولانا کی نظر میں اپنے جو معاصرین سیاسی اور قومی مجرم ٹھہرتے ہیں ان کی تصویر بھی مولانا اسی ٹھہراؤ، سنجیدگی اور نظر کی وسعت کے ساتھ مرتب کرتے ہیں جو ہمیشہ ان کی پہچان بنی رہی۔ ایک رچی ہوئی شائستگی، ایک وقار آمیز ضبط، ایک سوچی سمجھی اور وسیع المقصد احتیاط پسندی عمر بھر مولانا کی ہم رکاب رہی۔ مولانا کو قریب سے جاننے والے بتاتے ہیں کہ ذاتی معاملات پر گفتگو سے مولانا جس قدر گریز کرتے تھے، اجتماعی معاملات پر گفتگو میں اتنے ہی کھرے بھی تھے مگر ان کی صاف گوئی اور بے باکی، ان کی احتیاط پسندی اور شرافتِ نفس کا سحر قائم رکھتی ہے۔

''انڈیا ونس فریڈم'' کے تیس صفحات کا قضیہ بھی اسی لیے پیدا ہوا کہ مولانا کی شریعت میں

آبگینوں کو ٹھیس پہنچانا جائز نہیں تھا۔ اس ضمن میں ہمایوں کبیر یہ بتاتے ہیں کہ مولانا نے ''انڈیا ونس فریڈم'' میں افراد اور واقعات کی بابت کئی ایسے فیصلوں اور رایوں کا اظہار کیا ہے جن سے ہمایوں کبیر کو اختلاف تھا مگر چونکہ ان کا کام ''مولانا آزاد کے نتائج افکار کو صرف ریکارڈ کرنا تھا، اس لیے بیانیے میں اپنے ذاتی تاثّرات کی رنگ آمیزی'' کو ہمایوں کبیر معیوب سمجھتے تھے۔ البتہ کتاب کے پہلے ایڈیشن (1959ء) اور پھر متنازع تیس صفحات کی شمولیت کے بعد کتاب کے تازہ ترین ایڈیشن (1988ء) کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمایوں کبیر نے کئی جگہوں پر مولانا کے لہجے یا لفظ کی تیزی کو کم کرنے کے لیے چھوٹی موٹی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ یہ بکھرے ہوئے تیس صفحات نئے ایڈیشن میں کسی صفحے پر چند سطروں کا اضافہ کرتے ہیں، کہیں ایک دو پیراگراف کا، اور کہیں پرانے متن میں ایک آدھ نئے صفحے کا۔ ان تیس صفحات کی صحت کے بارے میں جو بحث اُٹھی ہے وہ ایک الگ مسئلہ ہے اور ایک الگ بحث کا موضوع۔ میں نے تو اس قصے سے صرف اس حد تک سروکار رکھا ہے کہ ''انڈیا ونس فریڈم'' کے مجموعی فریم سے خود مولانا کی جو تصویر اُبھرتی ہے اس میں پہلے تو ان صفحات کی عدم شمولیت اور پھر وقت کا ایک دَور گزر جانے کے بعد ان کی شمولیت سے کوئی فرق آیا ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تیس صفحات شامل نہ کیے جاتے، جب بھی کتاب کے بنیادی مقاصد و مسائل اور کتاب کا مزاج وہی رہتا جو ان صفحات کی شمولیت کے بعد سامنے آیا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی اور اجتماعی تاریخ پر پچھلے تیس برسوں کے واقعات نے جیسی بھی پرت چڑھائی ہے مولانا کے چہرے مہرے میں ان تیس صفحوں کے ظہور سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

یہ ہجوم میں رہتے ہوئے بھی اس سے الگ تھلگ، ایک تنہا اور دل گرفتہ انسان کی کہانی ہے۔ اس کے راستے اجتماعی ہیں، منزلیں اجتماعی۔ اس انسان نے اپنا پورا سفر اجتماعی ذمّے داری کے ایک دائم و قائم احساس کے ساتھ، رفیقوں کی ایک پوری جماعت کے ساتھ، عام اور بے چہرے انسانوں کی امنگوں اور آرزوؤں کے سایے میں طے کیا ہے مگر بڑی سے بڑی بھیڑ بھی اس کی خلوت میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ مولانا نے اپنے آپ کو اور اپنے وقت کو پوری طرح قوم کے لیے وقف کر دیا تھا مگر اپنی انفرادیت کی دہلیز پر ان کے پاؤں ہمیشہ بڑی مضبوطی کے ساتھ جمے رہے۔ اسی لیے

مولانا ماضی قریب کے ایک جانے پہچانے زمانے میں رہتے ہوئے بھی ایک مختلف ذہنی اور جذباتی موسم سے دوچار دکھائی دیتے ہیں۔

''انڈیا ونس فریڈم'' ایک آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ ایسی سوانح عمریاں جو دوسروں کے ذکر سے یکسر عاری ہوں اتنی ہی بیزار کن بھی ہوتی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں جو اجتماعی کہانیاں دہرائی ہیں بےشک، ان میں سے بیشتر کے ہیرو وہ خود ہیں۔ ہندوستان کی اجتماعی سیاسی جدّوجہد میں مولانا کے رول پر بحث کی جا سکتی ہے مگر آخری فیصلے میں یہ اعتراف بہرحال کرنا پڑے گا کہ اس رول کے حدود جو بھی رہے ہوں، اس کی اہمیت اور معنویت مسلّم ہے۔ اس کے علاوہ یہ پہلو بھی اہم ہے کہ مولانا نے دوسروں کے ذکر میں کم سے کم اپنی طبیعت کے وقار، اپنے ظرف کی بڑائی اور تاریخ کے ایک انتہائی پیچیدہ اور پُرآشوب دور کے تئیں اپنی دیانت داری پر آنچ نہیں آنے دی۔ اپنے رول کی اثر انگیزی کے بارے میں مولانا سے کوئی بھول ہوئی ہو تو ہو مگر اپنے ہم عصروں اور ساتھیوں کے رول پر مولانا نے کوئی پردہ نہیں ڈالا ہے۔ مولانا کی اپنی سرشت اور افتادِ طبع سے قطع نظر، اس امر کا امکان یوں بھی باقی نہیں رہتا کہ مولانا نے ''انڈیا ونس فریڈم'' میں ہماری اجتماعی سرگزشت کے جن ادوار اور واقعات کا بیان کیا ہے اُن کی صحت اور عدم صحت کا تعین کرنے والے کافی اصحاب مولانا کے سامنے موجود تھے۔ ان ادوار اور واقعات کا تعلق مولانا کی اپنی ہستی کے ساتھ ساتھ مولانا کے عہد کی تاریخ سے بھی تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمایوں کبیر کی حیثیت محض اس مسودے کے کاتب کی ہی نہیں تھی وہ مولانا کی رایوں سے اتفاق واختلاف اور مولانا کے بیانات کی تائید وتردید دونوں کی طاقت رکھتے تھے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ''انڈیا ونس فریڈم'' کی ترتیب کے دوران اس آزادی سے مکمّل طور پر محروم رہے جو انھیں اپنی دوسری کتابوں کو لکھتے وقت حاصل رہی تھی۔ چنانچہ یہ کتاب ایک اعتراف اور آپ بیتی ہی نہیں، کھلی عدالت میں ایک ذمّے دار، باخبر اور بےباک انسان کی گواہی بھی ہے۔

شمیم حنفی

دیباچہ

اشاعت1959ء

جب آج سے کچھ اوپر، دو سال پہلے، میں مولانا کی خدمت میں یہ درخواست لے کر گیا کہ انھیں اپنی آپ بیتی لکھنی چاہیے، تو میں نے ایک لمحے کے لیے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کی غم آمیز ذمے داری مجھے ہی انجام دینی ہوگی۔ مولانا اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں باتیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ ابتداءً اس کام کو ہاتھ میں لینے سے وہ جھجکے تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں یہ ماننے پر آمادہ کیا گیا کہ انگریزوں سے ہندوستانیوں کو اقتدار کی منتقلی کے عمل میں بہ حیثیت ایک اہم کردار کے، اُن پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ اس یادگار زمانے کے بارے میں اپنے تاثرات محفوظ کر دیں۔ اُن کی جھجک کا کچھ سبب ان کی خرابیٔ صحت بھی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ناگزیر سیاسی اور انتظامی امور کا جو بوجھ اُن پر ہے، اس سے نمٹنے کے لیے انھیں اپنی ساری توانائیوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ بالآخر، میری اس یقین دہانی پر کہ لکھنے کے اصل بار سے حتی الوسع میں انھیں بچائے رکھوں گا، وہ راضی ہوگئے۔ اس میں یہ قباحت تو بے شک ہے کہ ہندوستانی عوام اُن کے اپنے لفظوں میں اُن کی سوانح عمری پڑھنے سے محروم رہیں گے اور اس طرح ہندوستانی ادبیات میں بالعموم اور اُردو میں بالخصوص ایک کمی رہ جائے گی، لیکن کچھ نہ ہونے سے یہ بہتر ہوگا کہ ان کی ہدایت میں ایک انگریزی کی کتاب تیار ہو جائے۔

میں قدرے تفصیل کے ساتھ یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ کتاب کس طرح ترتیب دی گئی۔ پچھلے لگ بھگ دو برسوں میں، سوائے اُن مواقع کے جب مجھے دہلی سے باہر جانا پڑا، میں نے ہر شام کا اوسطاً ایک گھنٹہ مولانا آزاد کے ساتھ گزارا۔ وہ ایک حیرت انگیز باتیں کرنے والے شخص تھے۔ لفظوں میں اپنے تجربات کی تصویر اُتار دیتے تھے۔ میں خاصے تفصیلی نوٹ لیتا جاتا تھا اور کسی نکتے کی وضاحت یا کسی سلسلے میں مزید معلومات کی خاطر اُن سے سوالات بھی کرتا جاتا تھا۔ وہ ذاتی معاملات پر گفتگو سے تو مستقلاً انکار کرتے رہتے، لیکن ایسے تمام سوالات پر جن کا تعلق عام مسئلوں سے ہو وہ انتہائی بے باکی اور خلوص کے ساتھ بات کرتے تھے۔ جب ایک باب کے لیے میں کافی مواد جمع کر لیتا تو انگریزی میں ایک ڈرافٹ تیار کر کے جلد سے جلد اُن کے حوالے کر دیتا تھا۔ ہر باب پہلے وہ خود پڑھتے تھے، پھر ہم دونوں مل کر اسے دیکھتے تھے۔ اس منزل پر وہ اضافے اور تحریف یا ردّ و بدل کے ذریعے بہت سی ترمیمیں کرتے تھے۔ ہم نے اس سلسلے کو اسی طرح جاری رکھا، یہاں تک کہ ستمبر 1957ء میں، مَیں نے مکمل کتاب کا پہلا ڈرافٹ انھیں دے دیا۔

جب کتاب کا پورا متن مولانا کے ہاتھ میں آ گیا تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ لگ بھگ تیس صفحے، جن کا تعلق خاص طور پر ذاتی نوعیت کے واقعات اور تاثرات سے ہے، فی الحال شائع نہیں کیے جانے چاہییں۔ انھوں نے ہدایت دی کہ مکمل متن کی ایک مہر بند نقل نیشنل لائبریری، کلکتہ میں اور ایک نیشنل آرکائیوز، دہلی میں جمع کرا دی جائے۔ یہ فکر انھیں بہرحال تھی کہ ان صفحات کی علیحدگی سے نہ تو واقعات کا خاکہ بگڑنے پائے نہ اُن کے عام نتائج میں فرق آئے۔ ان کی ہدایات کے مطابق میں نے بتدیلیاں کیں اور نومبر 1957ء کے اواخر میں، نظرِثانی اور کاٹ چھانٹ کے بعد تیار ہونے والا مسودہ، مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا۔

انھوں نے ایک بار پھر، اُس زمانے میں جب میں آسٹریلیا گیا ہوا تھا، مسودے کا جائزہ لیا۔ میری واپسی پر، یکے بعد دیگرے تمام ابواب ہی نہیں، ایک ایک جملے پر ہم دونوں نے پھر سے نظر ڈالی۔ انھوں نے کچھ معمولی ترمیمیں کیں، کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس طرح

بعض معاملات سے متعلق ابواب تین یا چار بار دیکھے گئے۔ اب کے برس یومِ جمہوریہ کے موقع پر، مولانا آزاد نے فرمایا کہ اب وہ مسودے کی طرف سے مطمئن ہیں اور اسے طباعت کے لیے بھیجا جا سکتا ہے۔ سو یہ کتاب جس شکل میں سامنے آئی ہے، اُن کی حتمی منظوری کے مطابق مسودے پر مشتمل ہے۔

مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ یہ کتاب نومبر 1958ء میں ان کی سترویں سالگرہ کے دن شائع ہو۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور اب یہ کتاب سامنے آئے گی تو اسے دیکھنے کے لیے مولانا ہم میں موجود نہ ہوں گے۔

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، شروع شروع میں مولانا آزاد اس کتاب کی تیاری کا کام ہاتھ میں لینے پر کچھ زیادہ آمادہ نہیں تھے۔ جیسے جیسے کتاب بڑھتی گئی مولانا کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ پچھلے تقریباً چھ مہینوں میں بہت کم ایسا ہوا کہ مولانا نے اس مسودے کی تیاری کے کام میں کسی شام ناغہ کیا ہو۔ اپنی نجی زندگی کے بارے میں وہ انتہائی کم گو تھے، لیکن اخیر میں انھوں نے خود ہی یہ پیشکش کی کہ (سوانح کی) پہلی جلد وہ لکھ دیں گے، جو اِن کی زندگی کے ابتدائی ادوار کا احاطہ کرے گی اور ان کے 1937ء تک کے حالات پر مشتمل ہو گی۔ انھوں نے واقعتاً ایک خاکہ منظور بھی فرمایا، جو اُن کی اپنی خواہش کے مطابق، موجودہ کتاب کے پہلے باب کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ ارادہ بھی کیا تھا کہ 1948ء تک کے واقعات سے متعلق ایک تیسری جلد بھی وہ لکھیں گے۔ ہم سب کی بدبختی ہے کہ یہ جلدیں اب کبھی نہ لکھی جا سکیں گی۔

اس کتاب کے سلسلے میں کام کرنا میرے لیے ایک کاروبارِ شوق رہا ہے اور میں خوش ہوں گا اگر اس (کام) کے واسطے سے اس مقصد کی ترویج میں، جو مولانا آزاد کو دل سے عزیز تھا، مدد مل سکے۔ یہ مقصد عبارت ہے، ہندوستان کے مختلف فرقوں میں بہتر ہم آہنگی کے فروغ سے جسے دُنیا بھر کے انسانوں میں بہتر ہم آہنگی کی جانب ایک اولین اقدام کہنا چاہیے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام ایک دوسرے کو ہمسایوں اور

دوستوں کی طرح دیکھیں۔ ''انڈین کونسل فور کلچرل ریلیشنز'' کو وہ اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور کونسل کے خطبہ صدارت میں، جو ان کی آخری تیار کی ہوئی اور چھپی ہوئی تقریر تھی، انھوں نے ان دونوں ریاستوں کے افراد میں، جو صرف دس برس پہلے تک ایک غیر منقسم ملک کے باشندے تھے، مفاہمت اور ہمدردی کے رشتوں کو مستحکم کرنے کے لیے ایک پُرزور اپیل کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب سے حاصل ہونے والی آمدنی کا اس سے بہتر اور کوئی استعمال نہیں ہوسکتا کہ اسے ہندوستان اور پاکستان میں بسنے والے مختلف فرقوں کے درمیان بہتر ہم آہنگی کے فروغ کی خاطر، کونسل کو دے دیا جائے۔ اس لیے ایک حصے کو چھوڑ کر جو مولانا کے سب سے قریبی ورثا کو دیا جائے، اس کتاب کی بقیہ رائلٹی کونسل کو جائے گی جو (اس رقم سے) ہر سال دو انعامات دے سکے، ایک ایسے غیر مسلم کو 'اسلام' پر اور دوسرا ایک ایسے مسلمان کو جو 'ہندومت' پر بہترین مضمون لکھ سکے اور یہ دونوں چاہے ہندوستان کے شہری ہوں یا پاکستان کے ......نوجوانوں کے لیے مولانا کے دل میں جو قدر اور محبت تھی، اس کے پیش نظر، یہ مقابلہ ہر سال کی 22 فروری تک تیس برس یا اس سے کم عمر کے اشخاص تک ہی محدود رہے گا۔

اختتام سے پہلے ایک اور بات میں پوری طرح صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کتاب میں ایسی رائیں اور فیصلے بھی ہیں جن سے میں اتفاق نہیں کرتا، لیکن چونکہ میرا کام مولانا کے نتائج کو قلم بند کرنا تھا، اس لیے یہ بہت نامناسب بات ہوتی اگر اس بیانیے پر میں اپنے خیالات کا رنگ چڑھ جانے دیتا۔ جب وہ زندہ تھے، کئی بار میں نے ان سے اپنے اختلافات کا اظہار کیا، اور اس کشادہ طبعی کے ساتھ جو مولانا کے مزاج کا ایک مضبوط عنصر تھی، کبھی کبھار میری تنقید کی روشنی میں انھوں نے اپنے خیالات میں ترمیم بھی کی ہے۔ دوسرے موقعوں پر، اپنے مخصوص انداز میں وہ مسکراتے اور کہتے: ''یہ میرے خیالات ہیں اور یقیناً مجھے اس کا حق ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق انھیں ظاہر کروں۔'' اب جبکہ وہ نہیں ہیں تو ان کے خیالات کو اسی شکل میں آنا چاہیے جس شکل میں مولانا نے انھیں چھوڑا تھا۔

کسی بھی شخص کے لیے دوسرے کی رائے اور خیال کو تمام تر صحت کے ساتھ پیش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دونوں ایک ہی زبان کا استعمال کریں، جب بھی، ایک لفظ کی تبدیلی سے معنی کا دباؤ کم ہوسکتا ہے اور مفہوم کے رنگ میں خفیف سا فرق لایا جا سکتا ہے۔ اُردو اور انگریزی کی رُوح میں جو فرق ہے، وہ مولانا آزاد کے خیالات کی تعبیر کے مرحلے کو دُشوار تر بناتا ہے۔ ہندوستان کی دوسری تمام زبانوں کی طرح، اُردو زبان بھی مایہ دار ہے، رنگارنگ ہے اور طاقتور ہے۔ اس کے برعکس، انگریزی بنیادی طور پر ایک ایسی زبان ہے جس میں بیان کی لَے دھیمی رہتی ہے اور جب بات کہنے والا مولانا آزاد جیسا اُردو کا ماہر ہو تو اس شخص کی حالت کا قیاس آسانی سے کیا جا سکتا ہے جو مولانا کے خیالات کو انگریزی میں بیان کرنے کا حوصلہ کرے۔ ان دقتوں کے باوجود، میں نے مولانا آزاد کے خیالات کو اپنے بس بھر، دیانت داری کے ساتھ منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ واقعہ میرے لیے بہت بڑا انعام ہے کہ اس متن کو مولانا نے پسند فرمایا تھا۔

ہمایوں کبیر

نئی دہلی

15 مارچ 1958ء

’’انڈیا ونس فریڈم‘‘ نے آخرکار خود اپنی آزادی جیت لی۔ اس خودنوشت بیانیے کا مکمّل متن، مہر بند کر کے نیشنل لائبریری کلکتہ اور نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں تیس برس تک محصور رکھا گیا۔ 1958ء میں ’’راوی‘‘ مولانا ابو الکلام آزاد اور ’’راقم‘‘ ہمایوں کبیر نے اشاعت کے لیے ایک قدرے مختصر اور نظرثانی شدہ مسودہ پیش کیا تھا جس میں سے ایسے واقعات اور تاثرات جو بالخصوص ذاتی نوعیت کے تھے، الگ کر دیے گئے تھے۔ اشاعت کے پہلے ہی سال میں اس مسودے کے تین بڑے ایڈیشن نکلے اور اس وقت سے یہ بارہا شائع کیا جا چکا ہے۔ اب ہمارے سامنے مکمّل متن ہے جسے ایک عدالتی ہدایت کے ذریعے ستمبر 1988ء میں رہائی ملی۔ نہ صرف یہ کہ اصل عبارت کے تمام الفاظ اور فقرے جوں کے توں پیش کر دیے گئے ہیں بلکہ عبارت کا اصل لہجہ اور مزاج بھی پوری طرح بحال کر دیا گیا ہے۔ یہ متن اب اس امر کا انکشاف کرتا ہے کہ اب تک کے غیرشائع شدہ صفحات کے بارے میں بہت مدّت سے جو قیل و قال جاری تھی، وہ پوری طرح حق بجانب تھی۔ جنھوں نے پرانا ایڈیشن پڑھ رکھا ہے انھیں ایسے نکات کا اندازہ فوراً ہو جائے گا جن کے باعث یہ بیانیہ سابقہ بیانیے سے مختلف ٹھہرتا ہے۔

WWW.
BOOK CORNER
.COM.PK
Standard House of Publishing

Azadi-e-Hind
ISBN: 978-969-662-305-2
Rs.900.00

BookCornerJlm
bookcornershowroom
bookcorner
bookcornerjhelum
0314-4440882
Jhelum (Pakistan)

مئی 1946ء - برطانوی کابینہ کے کمیشن کے ممبران
سر سٹیفرڈ کرپس (دائیں جانب)،
اے وی الیگزنڈر (دائیں جانب سے دوسرے) اور
لارڈ پیتھک لارنس (بائیں جانب)،
ہندوستان کی آزادی کے منصوبے پر
مولانا ابوالکلام آزاد (کانگریس لیڈر)
اور آصف علی سے تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے۔

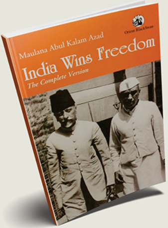

INDIA WINS FREEDOM
THE COMPLETE VERSION
FIRST PUBLISHED: 1988